ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

اسلام میں ملکیتِ زمین کا مسئلہ

اسلامی دنیا کے صحراؤں میں تیل کی دریافت اور اس کے استحصال سے پہلے اسلامی ممالک کی معیشت بنیادی طور پر زرعی تھی۔ آج بھی دنیا کے اکثر اسلامی ممالک زراعت پر انحصار رکھتے ہیں۔ اس لئے اسلامی دنیا کے ہر بہی خواہ کے لئے یہ چیز بڑی اہم ہے کہ وہ کاشتکار کی حیثیت اور اس کے مالکانہ حقوق پر غور و خوض کرے۔ تقریباً سبھی اسلامی ممالک میں معاشرتی اور سیاسی مفکروں نے اس مسئلے پر گہری توجہ دی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جو ترقی ہوئی وہ بحیثیت مجموعی معمولی سی ہے اور اطمینان بخش نہیں۔ ایسے ممالک میں جہاں کاشتکار آبادی میں ریڑھ کی ہڈی کے مثل ہوں وہاں کاشتکاروں کی پس ماندگی اور افلاس معاشرہ کے لئے ایک ایسی لعنت بن جاتے ہیں کہ پھر ان ملکوں میں نہ خوشحالی نظر آتی ہے نہ آزادی اور نہ ترقی۔ چنانچہ ایسے ممالک میں مفاد پرست عناصر حکومت کے تمام کل پرزوں پر اس مضبوطی سے قبضہ جما لیتے ہیں کہ انھیں ان کی اس پوزیشن سے ہٹانے کے لئے سخت جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ ایسے مفاد پرست عناصر کی پشت پناہی بعض اوقات مذہبی حلقوں کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اور یہ بات ہمارے موجودہ مذہبی فکر پر خواہ مخواہ اعتراض کا باعث بنتی ہے حالانکہ اسلام انفرادی یا طبقاتی استحصال کی حمایت نہیں کرتا۔ اگر ہمارے علماء نے اس بات کے سمجھنے میں تھوڑی سی زحمت بھی گوارا کی ہوتی کہ اسلام محنت کو پسند کرتا ہے اور ناانصافی کے خلاف خواہ وہ کسی شکل میں بھی کیوں نہ ہو، نبرد آزما ہوتا ہے تو ایسی صورت میں ہمارے یہ علماء زرعی اصلاحات کے بڑے پرجوش علمبردار ہوتے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہم زرعی اصلاحات کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے متعلق کسی قسم کی قیاس آرائی سے کام لیں۔ کیونکہ اسلام میں یہ بات بالکل سادہ اور صاف طور پر ظاہر کر دی گئی ہے۔

اسلام میں کاشتکار کی حیثیت

اسلام میں کاشتکار کو زمین کے مالک کی حیثیت دی گئی ہے۔ مسند امام احمدؒ میں ایک بہت واضح حدیث ملتی ہے۔ جسے امام بخاریؒ نے بھی بیان کیا ہے۔ اس حدیث میں صاف لفظوں میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ شخص جو بنجر زمین کو قابلِ کاشت بناتا ہے وہ اس کا مالک ہے۔ بشرطیکہ اس زمین کا پہلے کوئی مالک موجود نہ ہو۔ بعض فقہاء نے یہ طے کیا کہ ایسی غیر مزروعہ اور بنجر زمین پر حقِ ملکیت قائم کرنے کے لئے امام کی اجازت لینا ضروری ہے جس پر پہلے کسی کا قبضہ نہ ہو۔ اسلامی فقیہوں نے اپنے ان احکامات کی بنیاد زیادہ تر اسی حدیث پر رکھی ہے۔ ان سب میں مشہور ترین ہستی امام ابو یوسفؒ کی ہے۔ جنہوں نے اپنی تصنیف کتاب الخراج میں

یہ لکھا ہے کہ ہر وہ شخص اس زمین کا مالک ہے، جو اس زمین کا خراج ادا کرتا ہے۔ اسی طرح یحییٰ بن آدم القرشی نے ایک اور کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کا نام بھی کتاب الخراج ہی ہے۔ اس کتاب میں خراج اور عشر سے متعلق قدیم ترین روایات کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ایک الگ باب ایسے مسائل سے متعلق ہے جو خراج کی زمین کی خرید و فروخت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں ایک اور باب غیر مزروعہ اور بنجر زمین کو زیر کاشت لانے کے متعلق بھی ہے۔ اور جیسا اس مقالے کے شروع سے ظاہر ہو چکا ہو گا کہ غیر مزروعہ اور بنجر زمین کو زیر کاشت لانے کا مسئلہ بہت مشہور و معروف مسئلہ ہے۔ اس نقطۂ نظر میں جو بنیادی نظریہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ انسانی محنت ہی سے دولت پیدا ہوتی ہے۔ اسلامی فقہ کے بارے میں مشہور کتاب "الھدایہ" میں کہا گیا ہے۔ کہ اگر خراجی زمین کا مالک مسلمان ہو جائے تو بھی اسے خراج ہی ادا کرنا ہو گا۔ یہاں بھی اور بہت سی کتابوں کی طرح "مالکِ زمین" کی اصطلاح کا استعمال اس معنی میں ہوا ہے کہ زمین کا مالک وہی ہے جو خراج ادا کرتا ہو۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو غیر مزروعہ زمین کو زیر کاشت لائیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا ذمّی اس قانون کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے خواہ وہ خراج ادا کرتے ہوں یا عشر۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کاشتکار کا حقِ ملکیت تو اسلام میں اس قدر واضح طور پر مسلّم ہے کہ اس مسئلے کو زیر بحث لانا بھی بعض اوقات فضول سا دکھائی دیتا ہے۔

زمین کی قسمیں تاہم اس سلسلے میں اس صورت میں اختلاف بھی نمودار ہوئے جب مسلمان فاتحین نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں پر بعض خاص طریقوں کا نفاذ کیا۔ بعض اوقات مسلمان فاتحین اور مفتوحین میں زمین کے تصرف کے بارے میں بعض سمجھوتے طے پا جاتے۔ اور کسی ایسے سمجھوتے کے وجود میں آنے پر ایسی زمین کو صلحی زمین کہا کرتے تھے۔ بعض فاتحین نے پرانے مالکوں کے حقوق ملکیت کو ختم کر کے زمین کی سرکاری ملکیت قائم کی۔ اس قسم کی زمین کو "ارض المملکۃ" کہا جاتا تھا۔ ارض المملکۃ اور خراجی زمین کی حیثیت کو امام ماوردی نے جو عباسی عہدِ خلافت کے مشہور ماہرِ قانون سیاست دان اور مصنف ہیں واضح طور پر بیان کیا ہے۔ یہ تو ہر ایک بخوبی جانتا ہے کہ امام ماوردی کا نقطۂ نظر اپنے زمانے کے حالات اور ماحول سے گہرے طور پر متاثر ہے۔ چنانچہ انہوں نے دو قسم کی خراجی زمینوں کا ذکر کیا ہے۔ اوّل وہ خراجی زمینیں ہیں جنھیں مسلمانوں نے بزورِ جنگ حاصل کیا ہو۔ ایسی زمینوں پر حکومت کی ملکیت قائم ہو گئی اور یہ طے پایا کہ اس زمین کی کاشت کرنے والے محض مزارع ہونگے جنھیں ان کی محنت کے صلے کے طور پر پیداوار کا ایک حصّہ ملے گا۔ دوسری قسم کی زمینیں وہ ہیں جن پر مفتوحہ آبادی کے حقِ ملکیت کو چھیڑا نہیں گیا۔ اس ضمن میں آنے والی زمینوں پر کاشتکار کے حقوقِ ملکیت برقرار رہے۔ امام ماوردی نے اس قسم کی زمینوں کے مابین بعض اہم امتیازات کو بھی واضح کیا۔ چنانچہ ایسی زمین جس پر حکومت کی ملکیت ہو اسے کاشتکار بیچ سکتا ہے، نہ اسے منتقل کر سکتا ہے۔ لیکن جن زمینوں کا مالک کاشتکار ہو اسے یہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

نظریۂ ملکیت ۔ یہ نقطۂ نظر آج کے عہد کے نظریۂ ملکیت سے ملتا جلتا ہے چنانچہ آسٹن نے حقِ ملکیت کی تعریف یہ کی

ہے۔" ایک خاص چیز کا مطلقاً حقِ استعمال بلا کسی پابندی کے اس پر تصرف اور غیر محدود مدت کے لئے قبضہ۔" اسی طرح جان ڈبلیو سلومن نے لکھا ہے کہ کسی مادی شے کے بارے میں ہم حقِ ملکیت کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ اس شے کو استعمال کرنے کا مستقل حق ہو اور اسے ورثے میں دے دینے یا لینے کا حق بھی ہو۔ اسی کتاب کے حاشیے میں اس تعریف میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ حقِ انتقال و تصرف ایک ایسا بنیادی عنصر ہے جو حقِ ملکیت میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن اس کو حقِ ملکیت کی تعریف میں شامل کرنا یا اس کی تعریف کا ضروری جزو سمجھنا لازمی نہیں۔" امام ماوردی نے ان زمینوں کے بارے میں جن میں مسلمانوں کی فتوحات کے وقت کاشتکاروں کے حقِ ملکیت کو برقرار رہنے دیا گیا تھا، یہ وضاحت کی ہے کہ کاشتکار کو اپنی زمین پر ہر قسم کے مالکانہ حقوق حاصل ہوتے تھے۔ ایسے حالات میں ملکیت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ زمین پر کاشتکار کے حقوق و مفاد کی حیثیت مستقل تھی اور اسے اس کی زمین سے بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں زمین کو چھینا جا سکتا تھا۔ اس حقیقت سے بعض مغربی مصنفین کو کچھ غلط فہمی ہوئی اور اُنہوں نے زمین پر کاشتکار کے حقوقِ ملکیت کے خلاف استدلال کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کیونکہ ہر قسم کی ملکیت یا جائداد کو کسی قانون کے ذریعے سے یا بغاوت کے دوران میں یا لڑائی کی حالت میں آج بھی بعض ملکوں میں چھینا جا سکتا ہے لیکن یہ چیز ان مالکانہ حقوق سے متصادم نہیں ہوتی جو جائداد کے ضبط ہونے سے پہلے کسی کو حاصل ہوں۔ بلکہ جائداد کو ضبط کرنے کا مفہوم تو یہ ہے کہ مالکوں کے حقوقِ ملکیت کو ختم کیا جا رہا ہے اور ان کے بجائے حکومت خود یا اس کے نمایندے مالکانہ حقوق حاصل کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر مالکانہ حقوق کا وجود ہی نہ ہو تو ان حقوق سے کسی کو محروم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک برِصغیر پاکستان و ہند میں مسلمانوں کے عہدِ حکومت کا تعلق ہے اس کے بارے میں میں نے ایک الگ مقالے میں بحث کی ہے اور یہ مقالہ جرنل آف انڈین ہسٹری ۱۹۴۲ء میں چھپ چکا ہے۔ لہذا یہاں اس مقالے کے استدلال اور حقائق کو دہرانا فضول دکھائی دیتا ہے۔ مسلمانوں کے برِصغیر پاک و ہند پر عہدِ حکومت کے پورے زمانے میں وہ تمام لوگ جو خراج یا عُشر ادا کرتے تھے ان کے مالکانہ حقوق برقرار رہے۔ یہ نتیجہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت سے متعلق تاریخوں، تصنیفات اور دساتیرِ عمل اور بعض دستاویزوں پر مبنی شواہد سے اخذ کیا گیا ہے اور اس کی آئینِ اکبری اور عالمگیر اعظم کے دو مشہور فرمانوں سے تصدیق ہوتی ہے۔ میری رائے میں اس بات پر شبہ تک نہیں کیا جا سکتا کہ کاشتکار کے حقوقِ ملکیت مسلّم تھے۔ عالمگیر اعظم کے فرمانوں میں نہ صرف یہ کہ اصولوں کا بیان ہے بلکہ اس حالت میں بھی پیداوار کو برقرار رکھنے کے طریقوں کا ذکر ہے جبکہ زمین کے مالک کو پیداوار کے ذرائع خود میسّر نہ ہوں۔ ایسی صورت میں بھی کاشتکار کے مالکانہ حقوق میں مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو طریقے اختیار کئے جاتے تھے ان سے کاشتکار کے مالکانہ حقوق کا تحفظ ہوتا تھا اور کاشتکاری کے لئے خود اس کے پاس ذرائع کی عدم موجودگی میں بھی اس کے لئے آمدنی کا ذریعہ پیدا کر دیا جاتا تھا۔

نظام ارض المملکت

اگرچہ اس برصغیر میں ادارۂ ارض المملکۃ کا وجود نہیں ملتا لیکن اس کے باوجود اس پر بحث کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ بہت سے اسلامی ملکوں میں اور بالخصوص سلطنت عثمانیہ کے بعض علاقوں میں قائم رہا۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے نظام میں کاشتکار کو زمین پر ملکیت کا حق نہیں ہوتا تھا اور نہ وہ زمین کو منتقل ہی کر سکتا تھا اور نہ اسے بیع ہی کر سکتا تھا۔ اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ کہ جہاں کاشتکار کے حقِ ملکیت کو تسلیم کیا جاتا تھا وہاں یہ حقوق بھی اسے حاصل تھے۔ لیکن ارض المملکت کے نظام میں مزارع کو یہ حقوق حاصل نہ تھے۔ مگر ملکیت کے نقطۂ نظر سے اس بنیادی حقیقت کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسے ملکوں میں براہِ راست زمین سرکاری ملکیت ہوتی تھی۔ یعنی سرکار کے علاوہ زمین کا کوئی دوسرا مالک نہ ہوتا تھا۔ ملکیت کے مسئلے میں پیچیدگیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب سرکار اور کاشتکاروں کے مابین درمیانی حیثیت رکھنے والا ایک ایسا گروہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو زمین سے مزارعوں کو بے دخل بھی کر سکے اور ان کا تقرر بھی کر سکے۔ کاشتکار کو اپنی آئینی حیثیت اور اس کے دقائق کی چنداں پرواہ نہیں ہوتی جب تک اسے اپنی محنت کا مناسب صلہ ملتا رہے اور زمین پر اس کا قبضہ مستقل ہو۔ تاکہ وہ ذریعۂ معاش حاصل کرنے یا زمین کے کاشت کرنے کے سلسلے میں کسی فرد کی خواہشات کا تابع نہ ہو۔ ایسی زمینوں پر جو سرکاری ملکیت میں ہوں کام کرتے وقت کاشتکار کی حیثیت نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ اس صورت میں بھی زمین کا مالک نہیں ہوتا۔ اس بہتر پوزیشن کی وجہ یہ ہے کہ بالعموم حکومت کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ وہ مزارعوں کو خواہ مخواہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہے۔ بلکہ ایسی زمین پر ایک طرح سے ان مزارعوں کا حق قائم ہو جاتا ہے جو پہلے سے آباد ہوں۔ اور جب کاشتکار کا حکومت سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے تو اسے درمیانی حیثیت رکھنے والے گروہ کے ظلم و تشدد اور ہوس کا شکار بھی نہیں ہونا پڑتا۔ بلکہ اس کی حالت بہتر ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اگر کاشتکار کے حقِ ملکیت کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔ تاہم اگر زمین سرکاری ملکیت ہو تو بھی درمیانہ گروہ اسے اپنے مطالبات سے پریشان کرنے کے لئے موجود نہیں رہتا۔ اور کسان کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ اسے درمیانہ گروہ کے حقوق و اختیارات سے نجات حاصل رہے۔

کاشتکاروں کی زبوں حالی کا سبب

اسلامی دنیا میں کاشتکاروں کی بدحالی کی وجہ یہی درمیانہ گروہ ہے۔ اگر اسلام کے نزدیک حقِ ملکیت یا تو کاشتکار کو حاصل ہے یا بعض حالات میں حکومت کو، تو پھر آج اسلامی دنیا کے بہت سے حصّوں میں کاشتکار کو درمیانی گروہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دئے جانے کی کیا وجہ ہے؟ جو اس کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں اسلامی دنیا کے بہت سے حصّوں میں مختلف تاریخی واقعات اپنا اپنا کام کرتے رہے ہیں لیکن ان کے نتائج ایک ہی سے برآمد ہوئے ہیں ہندوستان میں برطانیہ نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں جاگیرداری نظام کے ان تصوّرات کو رواج دیا اور انہیں زرعی انتظامیہ اور زمین کے حقِ ملکیت کے سلسلے میں نافذ کیا جو ان کے اپنے ملک میں اب تک کسی نہ کسی شکل میں باقی تھے۔ ابتدائی یورپی سیاح اور منتظمین اس بنیادی اصول

کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت جاگیردارانہ نہیں تھی۔ بلکہ درحقیقت وہ ایک طرح کی نوکرشاہی تھی۔ جس میں بعض ملازموں اور خدمت گزاروں کو لگان جمع کرنے کے سلسلے میں تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ لیکن ایسے خدمت گزاروں کو ان علاقوں میں جہاں سے وہ لگان وصول کرتے تھے کسی قسم کے بھی مستقل حقوق حاصل نہیں تھے۔ یہ فقط لگان وصول کرنے کا ایک سہل طریقہ تھا۔ حکومت کسی کی طرف اپنے مالکانہ حقوق عارضی یا مستقل طور پر منتقل نہیں کرتی تھی۔ یہ لگان جمع کرنے والے زمین کی پیداوار میں حکومت کا حصہ جنس کی صورت میں بطور لگان اکٹھا کرتے تھے اور کوئی ایسا شخص جو اس سلسلے میں حکومت کی نمایندگی کرتا تھا۔ وہ صرف اس وقت تک کے لئے لگان اکٹھا کرتا تھا جب تک کہ کوئی خاص علاقہ اس کے سپرد رہتا۔ اور صرف حکومت کے لئے جنس کی صورت میں غلہ اکٹھا کرنا ہی ملازموں کے ذریعے نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ مالیہ کے اور شعبوں کی وصولی بھی انہی لگان وصول کرنے والوں کے یا اور نئے ملازموں کے ذریعے ہوتی تھی۔ اس قسم کی تحصیلِ زر واجب الوصول کی مقدار میں قابلِ ادائیگی تنخواہ کے مطابق کمی یا بیشی کر دی جاتی تھی۔ اور جب کسی ایسے حاکم کا تبادلہ ایک علاقہ سے دوسرے میں ہوتا تو سہولت کے پیشِ نظر اس کے رقبہ تحصیل میں بھی تبدیلی کر دی جاتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک سرکاری احکام کا تعلق تھا وہ یورپ کے جاگیردارانہ نظام سے مختلف تھے۔ لیکن جب برطانیہ نے بنگال پر قبضہ جمایا تو انہوں نے وہاں زمینداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کر دیا اور پھر اس کے بعد کاشتکاروں کے حقوق کا تحفظ کئے بغیر ایسے زمینداروں کو بندوبست دوامی کے ماتحت مقررہ شرح پر لگان ادا کرنے کے عوض مستقل حقوق عطا کر دئے۔ یہ اقدامات کچھ تو برطانیہ نے لاعلمی کے باعث کئے کیونکہ وہ ہندوستان کے زرعی انتظامیہ سے ناواقف تھے اور کچھ اس لئے بھی کہ وہ شعوری طور پر ایک مفاد پرست گروہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یعنی جب انگریز مقامی روایتوں سے کچھ واقف ہونے لگے اور انہیں کچھ تجربہ بھی ہوا تو انہوں نے اپنے طریقِ کار کو بدلنا شروع کیا۔ برصغیر میں آج جو حالت دکھائی دیتی ہے وہ بڑی حد تک برطانیہ کی پیدا کردہ ہے۔ بعض علاقوں میں شروع ہی سے برطانوی حکمت عملی نسبتہً بہتر اور حالات سے واقفیت پر مبنی تھی۔ تقسیم ملک سے پہلے بعض علاقوں میں ایسے اقدامات بھی کئے گئے جو کاشتکار کے حقِ ملکیت کے تحفظ کے سلسلے میں تھے۔ تاہم ملک کا جو حصہ پاکستان کو ملا اس میں ایسے اقدامات ابھی نہیں کئے گئے تھے۔ لہٰذا پورے برصغیر میں پاکستان وہ حصہ زمین ہے جہاں انتہائی پس ماندہ اور نامنصفانہ حقوقِ ملکیت برقرار ہیں۔ مشرقی پاکستان میں تو صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لئے بڑی حد تک مزروعہ زمینوں پر درمیانہ گروہ کے حقوق کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ پھر بھی کاشتکار کی حالت ابھی زیادہ اطمینان بخش نہیں اور شاید اس مسئلے پر اس وقت توجہ دی جائے گی جب حکومت اس اقدام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے گی۔

مغربی پاکستان میں صورتِ حال انتہائی غیر تسلی بخش ہے۔ یہ خیال کیا گیا تھا کہ اس تمام علاقے کو ایک صوبائی وحدت بنا دینے پر جاگیرداروں کے مفادات پر کچھ چوٹ پڑے گی اور ان کی حیثیت کمزور ہو گی۔ لیکن ابھی تک یہ

توقعات پوری نہیں ہوئیں اور کاشتکار کی حالت ناگفتہ بہ ہی ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ نے پنجاب میں جو زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اُن سے کوئی دوررس نتائج پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان پر بھی صحیح معنی میں عمل نہ ہؤا۔ علاوہ بریں وہ کچھ اچھی طرح سوچی اور سمجھی ہوئی اصلاحات نہیں تھیں تاہم ان کے عمل درآمد میں جو دُشواریاں پیش آتیں انھیں ابتدائی مراحل پر غور و فکر سے دور کیا جا سکتا تھا۔ سابق صوبۂ سندھ کی صورتِ حال تو بدترین ہے اور کاشتکار "ہاری" کی حالت نہ صرف پاکستان بلکہ اسلام کے دامن پر بدنما دھبے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور بھی بہت سے اسلامی ملکوں میں ایسے ہی حالات پائے جاتے ہیں۔ یہ سوال تعجب خیز ہے کہ ایسے ملکوں میں جہاں کسی غیر ملکی طاقت نے رخنہ اندازی نہیں کی اور روایات کا تسلسل برقرار رہا وہاں کیوں کر اسلامی روایات اور قوانین کے ماتحت قائم کیے ہوئے زرعی نظام کی صورت مسخ ہو گئی۔ اس قسم کے حالات پیش آنے کی بہت سی وجوہات ہیں۔

اسلامی ہند میں زرعی خرابیوں کا آغاز اگر ہم برِّصغیر پر اسلامی عہدِ حکومت کے حالات کی طرف نگاہ اُٹھائیں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ درمیانہ گردہ کے ظہور کے جراثیم اس زرعی نظام میں پیدا ہو چکے تھے۔ ایسا کاشتکار جو خراج ادا کرتا ہو اور جو زمین کا مالک ہو وہ اپنی مرضی سے اپنی زمین کاشت کروانے میں دوسروں سے بحیثیت مزدور مدد حاصل کر سکتا تھا۔ ابتدائی عہد میں جب زمین کی فراوانی تھی اور تھوڑی محنت سے زمین کو زیرِ کاشت لایا جا سکتا تھا تو زرعی مزدوروں کا حصول بہت مشکل تھا۔ لیکن جب زمین پر دباؤ اور بوجھ بڑھا اور روزگار کے دوسرے وسائل ختم ہونے لگے تو پھر زمین کی قدر و قیمت بھی بڑھی اور اس کے ساتھ ساتھ زمین سے محروم زرعی مزدوروں کا طبقہ بھی پیدا ہو گیا۔ ابتدائی ایام میں اس قسم کا طبقہ موجود تھا۔ لیکن آبادی کے بڑھنے اور زمین پر بوجھ کے زیادہ ہونے کے باعث یہ طبقہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اور تجارت اور کاروبار پر مغرب کے قبضے سے اسلامی ملکوں میں بدحالی پھیل گئی۔ اس بدحالی میں یورپ کے صنعتی انقلاب اور طریقِ زراعت کی ترقی نے بہت اضافہ کر دیا۔ کیونکہ ان حالات کے باعث مشرق کے ذرائع پیداوار فرسودہ ہو گئے اور مشرق مغرب سے مقابلے کا نااہل ہو گیا۔ تجارت تو پہلے ہی تباہ ہوئی تھی اب صنعت کو بھی زوال ہؤا۔ ادھر تو حکومت کے وسائل انحطاط پذیر ہوئے اور اُدھر روزگار کے ذرائع بند ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہؤا کہ زمین پر بوجھ ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گیا۔ اور چونکہ سائنس کے میدان میں کوئی ترقی نہ ہوئی اس لئے فی ایکڑ پیداوار بھی نہ بڑھ سکی۔ دوسری طرف بعض ملکوں میں آبی وسائل میں چونکہ بہت کم ترقی ہوئی اور مزید زمین کو زیرِ کاشت نہ لایا گیا لہذا پیداوار میں کمی بڑھتی ہی چلی گئی۔ بہت سے گھرانے اپنی معاش کے حصول کے قابل نہ رہے اور جہاں آبادی میں خاصہ اضافہ ہؤا وہاں زمین پر اور بھی بوجھ زیادہ ہؤا۔ اس طرح زمین بکنے لگی۔ چنانچہ وہ لوگ جن کے پاس روپیہ جمع کرنے کے دوسرے ذرائع تھے اُنھوں نے اس پیسے سے زرعی زمین کو خریدنا شروع کیا۔ یہ اس لئے ہؤا کہ روپیہ لگانے کے متبادل ذرائع موجود نہ تھے۔ چنانچہ چند ہاتھوں میں زمین کے وافر خطوں کے جمع ہونے کا عمل شروع ہؤا۔

اور ادھر کاشتکار کی حیثیت ایسے زرعی مزدور یا ایسے مزارعہ کی ہو کر رہ گئی جسے کسی وقت بھی بے دخل کیا جا سکے۔ چونکہ ایسے مزدوروں کو تنخواہ پر ملازم رکھنے میں کچھ کاروباری خطرات درپیش تھے نیز یہ کہ دیہی اقتصادیات میں سکے کا چلن عام نہیں تھا اس لئے جاگیرداروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو زرعی مزدوروں کو پیداوار کا ایک حصّہ دے کر کام پر لگانے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ زرعی مزدور اب وقتی مزدور نہ رہے جن کو جب چاہے ہٹا دو اور جب چاہے لگا لو۔ بلکہ ان کی حیثیت پیداوار کے ساجھی مزارعوں کی ہو گئی۔

قرونِ وسطیٰ میں جب کہ اقتصادی بدحالی ابھی نمایاں شکل میں عام نہیں ہوئی تھی۔ اسلامی ممالک کے زرعی ملکوں میں قبائلی گروہ کی ملکیتِ زمین کے جراثیم کچھ اور شکلوں میں بھی موجود تھے۔ مثال کے طور پر برصغیر ہند میں مسلمان فاتحوں کو کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے رئیسوں سے پالا پڑا جن کا مختلف النوع قانونی اقتدار مقامی حلقوں میں قائم تھا۔ فاتحین ان سب کو بیک وقت ختم نہیں کر سکتے تھے اور ان میں سے بعض تو کبھی بھی ختم نہ ہوئے۔ مثال کے طور پر باجگذار ریاستوں سے اسی قسم کا سلوک روا رکھا جا سکتا تھا جو ان کے قبولِ اطاعت کے وقت معاہدے کے تحت طے پاتا تھا۔ اس قسم کے معاہدوں میں مسلمان فاتحین کو کچھ ایسی مراعات ان لوگوں کو دینی پڑتیں جو انھیں مسلم فتوحات سے پہلے حاصل ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض کو باجگذار رئیس یا حاکم اپنے علاقے میں فقط اس شرط پر تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اسلامی سلطنت کے اقتدار اعلیٰ میں مداخلت نہیں کرینگے۔ ایسے راجاؤں کے ہاں ان کے اپنے طرز کے قوانین اور زرعی نظام موجود تھے۔ اور چونکہ ان کے اور کاشتکار کے درمیان بہت سے درمیانہ طبقے بھی موجود تھے، اس لئے وہ دستور کے مطابق جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ ان چھوٹے چھوٹے رئیسوں کے ماتحت جو علاقے تھے۔ ان میں وہ عوام کے قائد بھی مانے گئے کیونکہ عوام خاندانی اور قبائلی اثرات سے ان کا وفاداری کے ساتھ کہنا مانتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مقامی رسم و رواج اور پیداوار کی کیفیت سے پوری طرح باخبر بھی ہوتے تھے اور اس لئے بعض مجموعی فرائض کو انجام دینے کے لئے حکومت کی طرف سے انھیں اختیارات بھی دیئے جاتے تھے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لیتے تو انھیں سزائیں بھی دی جاتیں۔ تاہم یہ لوگ بہت کچھ اختیار رکھتے تھے اور بدامنی اور مرکزی حکومت میں کمزوری آجانے کے باعث ایسے ایسے رعایتی حقوق حاصل کر لیتے تھے جن کو زمانۂ امن میں حکومت ان کو چھین لینے کے لئے فکر مند رہتی۔ ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ انھیں کاشتکار کو لوٹنے کی آزادی حاصل نہ ہو۔ ان لوگوں کی ایک عام عادت یہ تھی کہ وہ کاشتکاروں میں وہ رقوم تقسیم کر دیتے تھے جو انھیں حکومت کو ادا کرنی چاہئے تھیں۔ لیکن جب کوئی حکومت زیادہ مضبوط اور مستعد ہوتی تو اس قسم کی بدعنوانیوں سے انھیں روکا جاتا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں جب ایک منظم حکومت کی جگہ انتشار اور ابتری نے لے لی تھی تو یہ بدعنوانیاں نہ صرف یہ کہ از سرِ نو زندہ ہو گئیں۔ بلکہ ہر مقامی سردار نے اپنی طاقت کو مضبوط تر بنا لیا۔ چنانچہ بہت سے رئیسوں اور قائدوں نے کچھ ایسے اختیارات حاصل کر لئے جو قانونی طور پر انھیں حاصل نہ ہو سکتے تھے۔

بنابریں برِّصغیر میں درمیانہ گروہ کے نمودار ہونے کی وجہ بڑی حد تک مرکزی حکومت کا انحطاط اور برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کے زرعی نظام کو غلط طور پر سمجھنا ہے۔ اس حادثہ کا اسلام کے نظریۂ ملکیت اور اصول حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ دیگر مسلم ممالک میں یہ حالت ایک حد تک تجارت اور صنعت کی بدحالی کے باعث پیدا ہونے والے اقتصادی بحران کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اسلام ایک ایسے زرعی نظام کا حامی نہیں ہے جس میں مزارعین اپنے روزگار کے لئے زمیندار یا جاگیردار کے رحم و کرم پر ہوں۔ اور پھر ایسے جاگیردار جو بعض صورتوں میں ان مزارعوں کو ابتدائی شہری حقوق تک دینے کے لئے تیار نہ ہوں۔

جاگیرداری کے تباہ کن نتائج

نامنصفانہ زرعی نظام قوموں اور ان کی سیاسیات کو جو صدمہ پہنچاتا ہے اس کے بارے میں جتنا بھی کہیں مبالغہ نہ ہوگا۔ کسی ملک میں قانون جس بات کی اجازت دیتا ہو ضروری نہیں ہے کہ وہ منصفانہ بھی ہو۔ کیونکہ جس طرح قانون منصفانہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح نامنصفانہ بھی ہوسکتے ہیں۔ بہر حال اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ قوانین کسی قوم میں برسراقتدار گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور یہ گروہ کمزور کو دبا کر نہ صرف انھیں نقصان پہنچاتا ہے بلکہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ اسلامی ملکوں میں اکثر یہ ہوا ہے کہ جاگیرداروں نے زرعی اصلاحات کی کوششوں کو ناکام بنا دیا ہے۔ اقتصادی نظام کے حلقۂ عمل میں یہ بات ظاہر اور ثابت ہو چکی ہے کہ کسی ملک میں ایک ایسے لٹیرے طبقے کا پیدا ہو جانا اور پھر اس کا برقرار رہنا جو قوم کی کوئی سود مند خدمات سرانجام نہ دیتا ہو بجز خطرناک ہونے کے اور کچھ نہیں۔ یہ ایک قسم کے موذی لٹیرے ہیں جو اقتصادیات کے لئے بھی ویسے ہی تباہ کن ہوتے ہیں جیسے کسی اور زندہ نظام کے لئے۔ جہاں تک کسان کا تعلق ہے اُسے جب تک اپنی ملکیت کے مستقل تحفظ پر بھروسہ نہ ہو اس وقت تک وہ پوری محنت سے کام نہیں کرے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ زرعی پیداوار بڑھنے کی بجائے متواتر گھٹتی چلی جائے گی۔ بڑے بڑے جاگیرداروں کو اتنی بھاری آمدنی ہو جاتی ہے کہ انھیں پیداوار کو بہتر بنانے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہوتی۔ محض نظریاتی سطح پر تو یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ پیداوار میں اضافہ جاگیردار اور مزارعہ دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ لیکن یہ تبھی ہوتا ہے جب جاگیردار بھی روشن دماغ ہو اور مزارع بھی۔ لیکن یہ روشن دماغی ہی وہ چیز ہے جو ایسے ماحول میں سب سے زیادہ ناپید ہوتی ہے۔ روشن دماغی کا تقاضا مفادات میں اشتراک اور شریک کا احترام ہوتا ہے۔ مگر یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے جب یہ رشتہ انصاف پر مبنی ہو۔ چنانچہ سندھ اور پنجاب کے بعض حصوں میں پیداوار کے گرنے کی وجہ یہ ہے کہ نہایت بے رحمی سے مزارعوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے گرتی ہوئی پیداوار کو دیکھ رہے ہیں۔ چونکہ زمین سے مفت آمدنی کا چسکا پڑ گیا ہے، جس میں کچھ بھی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ اس لئے زمین کے حصوں میں چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔ محض اس لئے کہ زمین کو جھپٹ لینے کے شوقین لوگ ایک دوسرے سے اپنے اپنے حصّے کے بارے میں متفق نہیں ہو سکتے۔ آبپاشی کے بعض منصوبوں کی تکمیل کے باوجود زمینوں کی الاٹ منٹ کا کام رکا پڑا ہے۔

زمین کو ٹیکس ادا کرنے والے شہریوں کے پیسے سے ترقی دی جاتی ہے۔ لیکن ٹیکس ادا کرنے والے کو اس سے کوئی فائدہ اس لئے نہیں پہنچتا، کہ طاقت ور گروہوں کی ہوس حصولِ زمین تسکین نہیں پاتی۔ جن ملکوں میں آبادی کی اکثریت مفلس زراعت پیشہ لوگوں پر مشتمل ہو ان کی عام قومی قوتِ خرید کم ہو جاتی ہے۔ چند ہاتھوں میں ملک کے محدود ذرائع پیداوار کے مجتمع ہو جانے کے باعث صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں سے درآمد کئے ہوئے قیمتی سامان کی منڈی تو پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس سے وسیع بنیادوں پر قائم ہونے والی گھریلو صنعت کو کچھ مدد نہیں ملتی۔ اگر ملک کی آبادی زیادہ ہو تو ناقص زرعی نظام اور پیداوار کی طرف سے جاگیردار اور مزارع دونوں کی عدم توجہی غلّے کی قلت پر منتج ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قابلِ قدر زرِ مبادلہ غلّے کی درآمد پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ضرورت سے کم خوراک ملتی ہے۔ بلکہ فاقوں تک نوبت پہنچتی ہے۔ انسانی محنت کا زیاں ہوتا ہے۔ کیونکہ ذرائع پیداوار سائنسی ترقی سے مطابقت نہیں رکھتے اور نیم بے روزگاری کی حالت پیدا ہو جاتی ہے جو کھلی بے روزگاری سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے اس سے اس حد تک محرومی کا احساس بیدار نہیں ہوتا جو نئے ذرائع کی تلاش میں مددگار ثابت ہو۔

عام آبادی اور خوش حال طبقوں کی معاشرت میں اس قدر تفاوت پیدا ہو جانے سے یہ باور کرنے میں کچھ دقت ہی پیش آتی ہے کہ وہ ایک ہی قوم یا ایک ہی نوعِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے اور انسان جانور کی سطح پر آگرتا ہے۔ اسلام نے اخوّت المسلمین اور نوعِ انسانی کی عزّت و احترام کا جو سبق دیا تھا اسے فخر و غرور کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے اور یوں اسلامی بھائی چارے کا جامہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

امورِ سیاست میں اس تفاوت کے باعث جو بدعنوانیاں پیدا ہوتی ہیں، ان سے انصاف کی عمارت زمین پر آگرتی ہے اور ہر طرف بدکرداری کا دور دورہ ہوتا ہے۔ دولت والے چند لوگ سرکاری ملازمین کو فرض شناسی سے غافل کر دیتے ہیں اور ملک کی انتظامیہ میں رشوت، خویش پروری، جانب داری، کینہ پروری اور ناانصافی پھیلتی پھولتی ہے۔ کیونکہ چند دولت مند لوگوں کو خوش کر کے حکام ہر قسم کے جرم کر گزرتے ہیں اور کام اور استعداد کار کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ پھر ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ بغیر اثر و رسوخ کے وسیلے کے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ صنعتِ کار طبقہ اور دوسرے طبقے استعداد کار اور وقت پر کام کی ضرورت کو سمجھتے ہیں۔ لیکن جاگیردار ان چیزوں کی اہمیت نہیں جانتا۔ کیونکہ اس کے طریقہ ہائے کار مشین کی استعداد کار سے اتنے زیادہ دور ہوتے ہیں کہ وہ استعدادِ کار کی ضرورت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ پھر اس کا رویہ اور طرزِ حیات اصولوں سے کچھ اس قدر ہٹا ہوا ہوتا ہے کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ انتظامیہ کو کچھ قواعد و ضوابط کے ماتحت چلنا چاہیئے۔ لہٰذا وہ قواعد و ضوابط کو اپنے اثر و رسوخ کو نظر انداز کرتے ہوئے لاقانونیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈکٹیٹر شپ کھلے طور پر یا مخفی انداز میں انہی جگہوں پر پیدا ہوتی ہے جہاں جاگیرداروں کو من مانی

کرنے کی کھلی آزادی ہوتی ہے۔

صنعتی سرمایہ دار کے وسائل بڑے وسیع ہوتے ہیں۔ اور ان وسائل سے وہ انتظامیہ اور حکومت کو بے اُصولی کے راستے پر چلا سکتا ہے اور چلاتا بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا طریق کار زیادہ پُر فریب و سیاست آمیز ہوتا ہے اور اس کے معیار جاگیردار کی سطح تک نہیں گرنے پاتے اس کے علاوہ سرمایہ دار کم از کم امن و امان کو اس حد تک برقرار رکھنا چاہتا ہے جس حد تک جاگیردار نہیں چاہتا۔ جاگیردار سیاسیات میں جو بے اُصولی پیدا کرتا ہے۔ اس کی بدترین شکل یہ ہے کہ وہ انتخابات کو اپنی مرضی کے مطابق کرا لیتا ہے۔ اس کا اپنے مزارعوں پر اقتدار اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اُنھیں دھمکی، دھونس اور دھاندلی کے ذریعے سے ہر بات منوا سکتا ہے اور طاقتور ہونے کی وجہ سے مقامی حکام کو دبا کر ان سے کام لیتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اُصول و عقائد پر چلنے والے کسی بھی سیاسی کارکن کے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ انتخابات میں کامیاب ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اثر اور طاقت کے ذریعے جاگیردار اکثر منتخب ہو جاتے ہیں۔ جس کا لابُدی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انہیں رائے عامہ کا کچھ بھی احترام نہیں رہتا۔ جس قسم کی پالیسی وہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ ملک سے غداری ہی کیوں نہ کریں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے حلقوں سے دوبارہ منتخب ہو جاتے ہیں۔ اور سازش اور جوابی سازش کا کھیل بغیر کسی جواب دہی کے خوف کے کھیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جمہوریت ایک کھیل بن جاتی ہے اور حکومت کا استحکام ختم ہو جاتا ہے۔ راتوں رات وہ اپنی پالیسیوں کو اور اُصولوں کو بدل دیتے ہیں اور حکومتوں کی تشکیل کرتے ہیں یا اُنھیں توڑتے ہیں اور یہ سب کچھ اصولوں کی خاطر نہیں بلکہ اپنے آپ کو برسر اقتدار رکھنے کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اور اقتدار سے اس لئے چمٹے رہنا چاہتے ہیں کہ اپنے خود غرضانہ اور قابلِ نفرت مقاصد کو پُورا کرتے رہیں۔ پاکستان کی بعض صوبائی اسمبلیوں کی تاریخ ان باتوں کی شہادت پیش کرتی ہے۔ جس قدر کسی اسمبلی میں جاگیرداروں کا زیادہ قبضہ ہوتا ہے، اُسی قدر اس کا ریکارڈ بھی زیادہ خراب ہوتا ہے۔ خود مرکزی حکومت میں پہلے وزیر اعظم کی شہادت کے بعد سے اسی قسم کے رجحانات کارفرما رہے۔

جاگیرداری کی پیدا کردہ یہ خرابیاں دوسرے مسلم ممالک میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ ایک مسلم ملک میں سیاسی زندگی کی بدعنوانیوں کی بیخ کنی کے لئے بادشاہ کو تخت سے اُتارنے اور انقلاب بپا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک اور ملک میں یہ حالت ہے کہ زمین کی ملکیت کا نظام کچھ ایسا ہے کہ حکومت خواہ کتنی ہی غیر مقبول کیوں نہ ہو اس کا دوبارہ برسر اقتدار آنا یقینی ہے کیونکہ دیہاتی علاقوں میں مقامی لیڈروں کو بڑے قلیل عرصے کے لئے زرخیز زمین پٹہ پر دی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ایسے لیڈروں کو زمینوں پر قبضہ رکھنا مقصود ہو تو لامحالہ اُنھیں اپنا ووٹ اسی کو دینا پڑے گا جس کے لئے اُنھیں ہدایت کی گئی۔ یہ چیزیں صحت مندانہ سیاسی پالیسیوں کی علامت نہیں۔ اگرچہ ایسی پالیسیوں میں اور بھی بہت سے نقائص موجود ہیں لیکن دراصل یہ زمین کی ملکیت کا نظام ہے جو ملک میں بے اطمینانی اور دھاندلی کا باعث

ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جو اسلامی ملکوں کے لئے بربادی کا سبب ہے۔

مؤثر علاج ان تمام مذکورہ بالا باتوں کے مان لینے کے بعد سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہے؟ اس بات میں کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مرض کا مؤثر علاج "دریمانے گروہ" کا خاتمہ کر دینا ہے لیکن اس راہ کے اختیار کرنے میں کچھ دشواریاں بھی ہیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ تو جاگیرداروں کی طاقت ہے۔ اس خودغرض طبقے کا طرزِ عمل ہی بعض ملکوں میں خونیں انقلاب اور بغاوت کا باعث بنا۔ لیکن یہ علاج بڑا انتہا پسندانہ ہے۔ اور اس سے کچھ ایسی قوتیں بروئے کار آجاتی ہیں جن پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے آمریت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ جو بعض اوقات پہلے سے بھی زیادہ یا اُسی حد تک بے رحمی سے عوام کا کچومر نکال دیتی ہے۔ اس کے علاوہ صحیح یا غلط تاریخی طور پر بعض ایسے حقوق پیدا ہو چکے ہیں جن کی نوعیت اقتصادی ہے۔ ایسے حقوق کو مناسب معاوضے کے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کے بارے میں جلد بازی ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اگر ذاتی جائداد یا ملکیت کو انتہا پسندانہ طریقے سے چھین لیا جاتا ہے تو اس سے ملک میں عدم اعتماد بھی پیدا ہوتا ہے اور بعض اور دشواریاں بھی جنم لیتی ہیں مسلمانانِ عالم جب ذاتی ملکیت کے حق کے احترام کا سوال اٹھاتے ہیں تو وہ کوئی غلط بات نہیں کہتے۔ جاگیرداروں سے ان کے حقوق لئے جانے تو چاہئیں لیکن ان کی قیمت کون ادا کریگا اور وہ قیمت کہاں سے آئے گی۔ اگر حکومت مناسب معاوضہ ادا کرتی ہے تو پھر اس صورت میں ٹیکس ادا کرنے والوں کو یہ قیمت ادا کرنی پڑیگی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنے سے ٹیکس ادا کرنے والوں کو مناسب فائدہ بھی پہنچے گا۔ ایاتی نقطہ نظر سے فیصلہ کرتے ہوئے اس چیز کا جواز اس بناء پر مہیا ہو جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے ٹیکس ادا کرنے والوں کو بہت سے بالواسطہ فوائد حاصل ہوں گے۔ لیکن اگر اس چیز سے کوئی براہِ راست فائدہ نہ پہنچے تو ایسی صورت میں ٹیکس ادا کرنے والوں کو اپنے لگائے ہوئے سرمایہ سے منافع حاصل کرنے کے لئے بہت دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ پھر اس صورت میں بھی منافع شاید نہ مل سکے، اگر کاشت کار کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے جو مناسب بھی ہو اور قابلِ عمل بھی۔

اس قسم کے انتظام کی ضرورت اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ قانون مزارعت جیسے کم تر قوانین سے حسب دلخواہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ایسے قوانین جاگیرداروں کی مداخلت سے بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی یہ بنیادی اعتراض بھی قائم رہتا ہے کہ کاشتکار کا معیارِ زندگی اس حد تک بلند نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ذرائع پیداوار سے مستفید ہو سکے۔ لہٰذا کاشتکاروں کو یہ ہدایت کرنی چاہئے کہ وہ جاگیرداریا زمیندار کے حقوق حاصل کریں۔ اور اس عمل کو کامیاب بنانے کے لئے حکومت کو ایک دیانت دار دلال کی حیثیت اختیار کرنی چاہئے۔ حکومت کو سب سے پہلے زمین کی مناسب قیمت مقرر کرنی چاہئے۔ اور اس قیمت کو سالانہ قسطوں کی شکل دینا چاہئے۔ قیمت کی ادائیگی کی

مدت بیس سال تک ہونی چاہیئے۔ یہ چیز جاگیرداروں کے لئے اتنا وقت ضرور مہیا کر سکے گی کہ وہ نئے نظام کیلئے اپنے آپ کو تیار کر لیں۔ ادھر کاشتکار کو چاہیئے کہ وہ باقاعدہ طور پر سالانہ لگان کے ساتھ ان قسطوں کو ادا کرے۔ یہ قسطیں اس انداز سے مقرر ہونی چاہئیں کہ کوئی قسط بھی نقد قیمت کے لحاظ سے اس مقدار سے نہ بڑھے جو زمیندار پیداوار میں سے اپنے حصہ کی حیثیت سے وصول کرتا ہے۔ اس صورت میں کاشتکار پر بوجھ نہیں پڑے گا۔ کیونکہ اسے اتنی ہی رقم ادا کرنی ہوگی جتنی وہ پہلے کر رہا ہے۔ اس مدت میں بھی جب کہ وہ قسطیں ادا کر رہا ہوگا وہ پہلے سے نسبتہً بہتر حالت میں ہوگا کیونکہ اس کا قبضہ محفوظ ہوگا اور وہ اپنے آپ کو زمین کا مالک سمجھنا شروع کر دے گا۔ قوم کو بھی اس صورت میں فائدہ ہوگا۔ کیونکہ کاشت کار زمین اور پیداوار کو بہتر بنانے کی زیادہ کوشش کرے گا۔ بہت تھوڑے وقت میں پیداوار بہتر ہو جائے گی اور لگاتار اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ حکومت کو جاگیرداروں کو یہ ضمانت دینا چاہیئے کہ انکو ان کی زمین کی منصفانہ قیمت ملے گی۔ پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ انشورنس کی ایسی اسکیم جاری کی جانی چاہئے کہ جب فصل خراب پیدا ہو اور کاشت کار ناگزیر اور اپنی قدرت سے باہر حالات کی بنا پر قسطوں کو ادا نہ کر سکے تو حکومت کاشتکار سے وصول کردہ قیمت کی تدریج کم ترقی صد مقدار ہر سال جاگیردار کو نقدی کی صورت میں دے اور باقی مقدار کو ایسی صنعتوں کے حصول اور تمسکات کی صورت میں ادا کرے جو مستحکم ہوں۔ تاکہ ابتدائی مشکلات پر قابو پانے کے بعد جاگیردار ملک کی ترقی میں حصہ لے سکے اور صنعتی پیداوار کے ثمر سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ کسانوں سے وصول ہونے والی کل سالانہ رقم بعض علاقوں کے موجودہ لگان کی رقم سے کہیں زیادہ ہوگی۔ اس رقم کو مفید اور تعمیری منصوبوں میں لگایا جا سکے گا اور یوں درمیانہ گروہ کے زمین سے متعلق حقوق کو ختم کرنا مجموعی طور پر فائدہ مند ہوگا۔

جاگیرداری کو ختم کرنا ہی ایک ایسا کام نہیں جو ضروری ہے بلکہ اس قسم کے سوالات بھی درپیش ہیں کہ ایک شخص یا ایک کنبے کو بیک وقت کس قدر زمین پر قابض ہونا چاہیئے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اگر ہم جاگیرداری کی برائیوں کو ایک نئی شکل میں ابھرنے سے روکنا چاہتے ہیں تو اس کا بھی انتظام ہو کہ پیسے والے لوگ زمین خرید نے نہ پائیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قطعہ ہائے زمین کو امداد باہمی کی انجمنوں اور قانون سازی کے ذریعے مجتمع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ان مسائل کا براہ راست زمین کے ملکیتی حق سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے میں ان پر کسی قسم کی رائے زنی سے اجتناب کرتا ہوں۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا عوامی مفاد کے لئے جبراً ملکیتی حقوق کو مالک کی مرضی کے بغیر چھین لینے کی اسلام میں اجازت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ملکیت کے ایسے غیر محدود نظریئے کو تسلیم نہیں کرتا جو کسی فرد سے ناانصافی پر مبنی ہو اور جو عوامی بہتری کے خلاف ہو۔ بلکہ ملکیت کے غلط استعمال سے اگر معمولی سا فتنہ بھی پیدا ہو تو اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ قرونِ وسطیٰ میں حسبہ (محاسبے) کا شعبہ اس بات پر پوری توجہ رکھتا تھا اور نہ صرف یہ کہ وہ ناجائز استعمال

کا تدارک کرتا تھا، بلکہ ایسے لوگوں کو سزائیں بھی دیتا تھا جو اپنی بداعمالیوں پر اصرار کرتے۔ تاہم ان ملکوں میں جہاں زمین ارض المملکت تھی وہاں ایسے قانونی مسائل پیدا نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ ملکیت کا جھگڑا موجود ہی نہیں تھا۔ برصغیر ہندو پاکستان میں انگریزوں نے اس نظریئے کی ترویج کی کہ زمین کی ملکیت کا حق حکومت کو حاصل ہے۔ اس تبدیلی کو لوگوں نے آسانی سے قبول کر لیا کیونکہ اس میں کسی قسم کے احتیاج کی مثال نہیں ملتی اس لئے حکومت کی تبدیلی اور مسلمانوں کے ہاتھ سے طاقت کے چلے جانے کے باعث قدیم تر نظریئے کو اب درست نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ حکومت بجا طور پر یہ کہہ سکتی ہے کہ وہ زمین پر قبضہ جمانا نہیں چاہتی بلکہ کچھ ایسے حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے جو اس کی پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں اور جنھیں قانون کے ذریعے بدلا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا حکومت پر یہ الزام عائد نہیں ہو گا کہ وہ مالکوں کی مرضی کے بغیر زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے بلکہ وہ تو درمیانہ گروہ کے حقوق کو حاصل کرے گی اور مناسب معاوضہ دے کر ایک ایسی چیز کو واپس لے گی جو اس نے خود عطا کی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ ایک نظری بحث ہے کیونکہ کوئی حکومت حقوقِ ملکیت کو استقرار مضبوط اور ناقابلِ شکست نہیں سمجھتی کہ مناسب معاوضے کو جسے کسی آزاد حکومت نے طے کیا ہو ادا کر کے وہ ان حقوق کو حاصل نہ کر سکے۔ میرے خیال میں ملکیت کا یہ تصور اسلام کی روح کے منافی نہیں ہے۔ ایک اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے حقوق کو ختم کرے یا انھیں چھین لے جو پوری قوم کے لئے نقصان دہ ہوں۔ کئی ایک مہذب نظامِ آئین میں جائداد اسی حد تک محفوظ ہے کہ اسے مناسب معاوضے کے بغیر چھینا نہیں جا سکتا۔ اسلامی قوانین اس سلسلے میں منفعتیات کی حیثیت نہیں رکھتے اور فقیہوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر فوج جہاد پر جا رہی ہو تو اس کے راستے میں کھیتوں کی کھڑی فصلیں اس کو گزرنے سے نہیں روک سکتیں اور انہیں تباہ یا ضائع کر دیا جائے گا۔ اس کے لئے جو شرط لازمی ہے وہ یہ ہے، فصل کے مالک کو مناسب اور منصفانہ معاوضہ دے دیا جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ فوج آگے بڑھنے سے رک جائے صرف اس لئے کہ مالک اپنے حقوقِ ملکیت کے قلعے میں اس قدر محفوظ ہے کہ وہ ایک جائز اور صحیح نصب العین کے لئے لڑنے والی فوجوں کو آگے بڑھنے سے روک سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ملکیتی حقوق کو صرف اسی وقت چھیڑنا چاہئے کہ جب ایسا کرنا مفادِ عامہ کے لئے ضروری ہو۔ لہٰذا درمیانی گروہ کے حقوق کو چھین لینے کے لئے کوئی قانونی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے حقوق کو ختم کرے۔

مسئلہ زمین اور اسلام
مصنفہ پروفیسر محمود احمد
قیمت چار روپے چار آنے
ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور